ساجد حمید

قرآن میں تقویتِ دلالت کا اضافی اہتمام

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عام بول چال کی دلالت میں قطعیت بالعموم مانی جاتی ہے۔ روز و شب کی ہماری گفتگو میں ابلاغ مدعا کے مسائل کم ہی پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ ہماری یہ گفتگو زیادہ تر مادی امور سے متعلق ہوتی ہے۔ گرچہ ہم وہاں بھی مجاز، کنایے اور معنویت پر مبنی اسالیب کو استعمال کرتے ہیں، مگر وہ حالات کے اندر اس طرح گُندے ہوئے ہوتے ہیں کہ باتیں اور ان کی دلالتیں واضح اور دوٹوک ہوتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے کلام الٰہی بھی وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے نازل ہوتا رہا۔

لیکن اپنے حالات سے جدا ہو کر کلام جب ماثور ہو جائے تو اس کی قوتِ دلالت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے ظنی اور بعض اسے کاملاً سامع کے فہم پر منحصر مانتے، اور سخن ور (author) کو کلام سے خارج مانتے ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ انسانی فطرت کا عجیب مظہر ہے کہ انسان کا ملکۂ اظہار مختلف صورتوں میں مختلف طریقے سے بات کرتا ہے۔ پس منظر سے واقف سامعین سے بات ہو تو ہم ضروری بات بتانے پر اکتفا کرتے ہیں، ناواقف سے معاملہ ہو تو تفصیلات بڑھا دیتے ہیں۔ درحدیث دیگراں بات جتانی ہو تو ہم ایسی معلومات کلام میں لے آتے ہیں کہ سامع کو کان ہو جائیں۔ خطوط تفصیلات و انداز میں روزمرہ کی گفتگو سے مختلف ہوتے ہیں۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ہم ابلاغ مدعا کے لیے ہزار جتن کرتے ہیں۔ ہم صاف لفظوں میں بات نہ کہنا چاہیں تب بھی، اور صاف لفظوں

میں کہنا چاہیں تب بھی اتنی قوتِ اظہار رکھتے ہیں کہ ابلاغ کر دیتے ہیں۔ ہماری اس صلاحیت کو اللہ تعالیٰ نے بیان کا نام دیا ہے نہ کہ صرف زبان کا۔

بولتے یا لکھتے وقت جب غیر معین سامع کا لحاظ بھی ہو تو ہماری قوتِ بیان ایسے تمام قرائن زیبِ کلام کر دیتی ہے کہ حاضر سامع کے ساتھ غیر معین سامع بھی ہمارا مدعا پا سکے۔ لہٰذا ابلاغ کے لیے لکھا گیا ہر کلام اپنی دلالت میں واضح ہوتا ہے۔ ان کلاموں کو باعتبارِ وضوح قطعیت یا اس سے کم درجوں میں رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ انسان کی قوتِ بیان کا فرق اور خطا و نسیان کلام کو قطعیت کے درجے سے نیچے گرا سکتے ہیں۔

ہمارا یہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان ابلاغِ مدعا میں عموماً کامیاب رہتا ہے۔ لیکن جدید ماہرینِ لسان اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں زبان ابلاغ مدعا کے لیے ناقص ذریعہ ہے۔ لیکن یہ نظریہ انسانی تاریخ کے مطالعہ میں درست ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ حقیقتِ واقعہ ہے کہ انسانی تاریخ ہمارے علوم و اخبار کے نسل درنسل انتقال و حصول کا نام ہے۔ واضح ہے کہ ان علوم کا ابلاغ محض لسانی پیرائے ہی میں ہوتا آیا ہے۔ یہ عمل ''نقص بیانی'' کے باوجود ہوتا آ رہا ہے، یہاں تک کہ ہمارا قافلۂ علم وعرفان بہت دور تک نکل آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مزعومہ ''نقص بیانی'' بھی ابلاغِ معنی میں رکاوٹ نہیں بنی۔ تاریخ نے یہ عجیب منظر بارہا دیکھا ہے جو منظر فکر یونان کے عربی تراجم کے وقت ہوا کہ ایک فلسفہ ناآشنا قوم محض تراجم کی بنیاد پر نہ صرف فلسفہ آشنا بن جاتی ہے، بلکہ اس کی ترویج و ترقی کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ پھر عرب قوم جب اس فکر کو مغرب کے حوالے کرتی ہے تو پھر زبان ہی کے ذریعے سے یہ عمل ہوتا ہے۔ لہٰذا، جب انسان اتنے دقیق اور اتنے مشکل تصورات کو بیان کر سکتا اور دوسروں سے اسے حاصل کر سکتا ہے تو یہ عمل زبان کی دلالت کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ یہ عمل قبل از تاریخ سے ہوتا آ رہا ہے، اور آج تک جاری ہے۔ زبانوں نے کئی روپ بدلے، کئی زبانیں مر چکیں، کئی نئی پیدا ہو رہی ہیں، لیکن ابلاغ کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ہم آج بھی ارسطو و فلاطون کے حوالے دیتے اور ابراہیم و نوح (علیہما السلام) کی باتیں سمجھ سکتے ہیں۔ ازمنہ قدیم میں لکھی ان کی باتوں کو سمجھ لیتے ہیں۔

ہمارے خیال میں ہر کلام اپنی دلالت میں واضح و دوٹوک ہوتا ہے۔ قرآن مجید ان سب کلاموں سے بڑھ کر دلالت میں واضح ہے — میں عقیدۃً نہیں کہہ رہا — بلکہ لسانی پہلو ہی سے کہہ رہا ہوں۔ قرآن مجید میں — عام کلاموں کے برعکس — کچھ ایسی چیزیں استعمال کی گئی ہیں، جو اسے دلالت میں کہیں بڑھ کر قطعیت عطا کر دیتی ہیں۔ ہم بات میں آسانی کے لیے ان چیزوں کو ادواتِ ابلاغ کا نام دے لیتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

زبان کا چناؤ

قرآن کا فرمان ہے:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ. ''ہم نے اس کتابِ الٰہی کو عربی میں نازل کیا ہے تا کہ یہ اسے سمجھ سکیں۔'' (یوسف ۱۲:۲)

اللہ تعالیٰ نے انسانی زبانوں میں سے بالعموم اور اولادِ ابراہیم کی زبانوں میں سے بالخصوص عربی زبان[۲] کو چنا ہے، جو دیگر زبانوں کی نسبت تعددِ احتمالات کو رد کرنے کی کچھ زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ غالباً عربوں کو اپنی زبان کی اسی خوبی کا شعور تھا، جس کی وجہ سے وہ باقی اقوام کو عجمی (بولنے میں لکنت والا) کہتے تھے۔ ردِ احتمالات کے باب میں عربی میں بہت سی خوبیاں ہیں، جو اسے باقی زبانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ چند ایک ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

اعراب

یہ عربی زبان کی ایک خوبی ہے، جو ردِ احتمال میں مددگار ہے۔ عربی میں الفاظ پر نحو (grammar) کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو کے جملوں: ''میں نے پانی پیا''، اور ''پانی بہ گیا'' ــــ میں پانی پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جب کہ عربی میں دیکھیے 'شربتُ الماءَ' اور 'سال الماءُ' میں اعراب کس طرح 'الماء' پر ظاہر ہوئے ہیں۔ ان اعراب کی بنیاد پر کلمات کی نحوی حالتوں کی پہچان میں عربی زبان سب سے زیادہ معاون ہے۔ اعراب بہت سے مواقع پر رداحتمالات میں مددگار ہوتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مفصل صیغے

عربی زبان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں مذکر مؤنث، واحد جمع اور تثنیہ وغیرہ کے لیے ضمائر، اسماء اور افعال کے بہت زیادہ صیغے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اس میں افعال کے چودہ اور ضمائر کے بارہ صیغے بنتے ہیں وغیرہ۔ اس قدر صیغوں کی موجودگی کی وجہ سے کلام میں فاعل ومفعول ضمائر کے مراجع وغیرہ کے تعین میں باقی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ مثلاً 'ھُم' کی ضمیر ذوی العقول کے لیے بولی جاتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں 'عَرَضَهُمۡ' (۲:۳۱)

۱؎ 'أداة' کی جمع، یعنی آلہ tool۔

۲؎ کوئی شخص یہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ عربی تو انسانی زبان ہے۔ جی ہاں، ایسا ہی ہے، لیکن خدا نے انسانی زبانوں میں سے عربی کا چناؤ کیا ہے، جب کہ ہم چناؤ نہیں کرتے۔ ہم آپ تو کسی زبان کے وطن میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب کے لیے باقی تمام زبانیں چھوڑ کر اسے چنا ہے۔

میں ضمیر 'ھُم' بولی گئی ہے، لیکن یہاں اس کا مرجع 'اَلْاَسْمَآء' ہے، جو کہ غیر ذوی العقول میں سے ہے۔ جس کے لیے 'ھُم' کی ضمیر مناسب نہیں ہے، سوائے اس کے کہ 'اَلْاَسْمَآء' بول کر ان کے ذوی العقول مسمّی مراد ہوں۔ چنانچہ ہم محض اس ضمیر کی وجہ سے وہ تفسیر رد کر سکتے ہیں کہ جو 'اَلْاَسْمَآء' سے غیر ذوی العقول اشیا کے نام مراد لیتی ہے۔ لہٰذا، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عربی ضمائر و اسماء کسی بھی زبان کے مقابلے میں تعین مدعا میں زیادہ مددگار ہیں۔

قراءت

عربی کو چننے کے بعد، ردِ احتمالات کے لیے قرآن کا یہ دوسرا اضافی اہتمام ہے، جو عربی کے خصائص ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف لکھا ہوا کلام ہی نازل نہیں کیا، بلکہ اسے جبریل علیہ السلام کی زبانی قراءت بھی کرایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ. (القیامہ ۷۵: ۱۷-۱۹)

''اس کا جمع کرنا اور قراءت کرنا، سب ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے جب ہم اس کی قراءت کریں تو اس کی اس قراءت کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی ذمے ہے کہ ہم اس کی وضاحت کر دیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قراءت تمام زبانوں میں اہمیت رکھتی ہے، لیکن عربی زبان میں اس کی اضافی اہمیت ہر عربی شناس جانتا ہے۔ مثلاً 'ذھبت' کا صیغہ واحد متکلم، واحد مؤنث غائب، واحد مذکر مخاطب، واحد مؤنث مخاطب کے لیے یکساں احتمال رکھتا ہے۔ اب اگر اس کی قراءت کر دی جائے احتمالات ختم ہو جائیں گے۔ اگرچہ سیاق و سباق بھی مدد و معاون ہوتا ہے، لیکن بعض مقامات پر سیاق و سباق مددگار نہیں ہوتا، وہاں احتمالات کو قراءت کی مدد سے زائل کر دیا جاتا ہے۔

اس کی سب سے واضح مثال آیتِ وضو میں 'اَرْجُلَکُم' کے الفاظ ہیں۔ اگر قراءت موجود نہ ہو تو سیاق و سباق کی مدد سے واضح رجحان 'اَرْجُل' کے مجرور، یعنی 'اَرْجُلِکُم' ہونے کا بنتا ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ متواتر قراءت میں اسے منصوب 'اَرْجُلَکُم' پڑھا گیا ہے۔ اس قراءت کی تائید سنتِ متواترہ میں عمل وضو سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن اگر قراءت نہ کی جاتی تو ہر قاری کے لیے یہ احتمالات موجود رہتے، جنھیں قراءت نے ختم کر دیا ہے۔ یا فقہا یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ سنت نے تخصیص کر دی ہے۔ یوں احتمالات کی تردید کے لیے قراءت بھی ادواتِ ابلاغ میں سے ایک اہم چیز ہے۔

قراءت کی اسی اہمیت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ قراءت کرنے کا پورا اہتمام کیا گیا، بلکہ اسے محفوظ کرنے کا بھی پورا بندوبست کیا گیا۔ سورۂ قیامہ کی مذکورہ بالا آیات (۷۵: ۱۷-۱۸) میں اس اہتمام کو بیان کیا گیا ہے۔ قراءت کی یہی اہمیت ہے جس کی وجہ سے صحابہ نے بھی جب قرآن کے نسخے تیار کیے تو ساتھ حفاظ بھی بھیجے تاکہ وہ اعراب و حرکات کو صحیح صحیح پڑھ کر طلبہ کو سکھائیں۔ اسی اہمیت کو سمجھتے ہوئے حجاج بن یوسف نے قراءت کو محفوظ کرنے کے لیے اعراب ایجاد کیے[۳] اور قرآن کے متن پر ثبت کر دیے تاکہ قراءت تحریر میں بھی محفوظ ہو جائے، اور حفاظ معلمین کے بغیر بھی سیکھی جا سکے۔ اس لیے ان علما کی بات درست نہیں ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا متن متواتر ہے، اور اس کی قراءت قاری (reader) پر چھوڑ دی گئی ہے۔ قراءت بس وہی مانی جائے گی جو جبریل امین نے حکم الٰہی سے نبی صادق و امین کو سکھائی اور انھوں نے امت کے حفاظِ قرآن کے ذریعے سے تواتر کے حوالے کر دی تاکہ تا قیامت حجت قائم کرتی رہے۔

چنانچہ احتمالات کے رد کے لیے اللہ علیم و خبیر نے پہلا کام تو یہ کیا کہ عربی کو اظہارِ مدعا کے لیے چنا۔ دوسرا کام یہ کیا

---

۳ بعض مسلمان اور مستشرقین یہ خیال کر لیتے ہیں کہ اعراب لگانا شاید متنِ قرآن میں تبدیلی ہے۔ واضح رہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اعراب کی دو قسمیں ہیں: ایک حرکات جو لفظ کے تلفظ سے متعلق ہیں، مثلاً میں گھر گیا۔ اس میں لفظ 'گھر' کے گاف پر زیر اور زبر پڑھنے سے معنی بدل جائیں گے۔ یہ حرکات ہیں، یہ بھی معنی پر اثر انداز ہوتی ہیں، اس جملے کا سیاق و سباق اگر مدد نہ کرتا ہو، تو ہمیں تلفظ، یعنی قراءت سے مدد ملے گی کہ بولنے والے نے گھَر بولا ہے یا گھِر بولا ہے۔ اعراب کی دوسری قسم کو اعراب ہی کہا جاتا ہے، جو نحو (grammar) کی وجہ سے آتے ہیں۔ مثلاً ''لڑکا آیا''، ''لڑکے نے کھایا''۔ ان دونوں جملوں میں ''لڑکا'' اور ''لڑکے'' کے آخر پر الف اور یے نحو کی وجہ سے آئے ہیں۔ عربی میں یہ اعراب حروف سے بھی ظاہر ہوتے ہیں، جیسے 'ضربت عابدًا جالسًا' میں 'عابد' اور 'جالس' کے آخری الف سے ہوا ہے، لیکن بالعموم اسے زیر، زبر اور پیش کی آوازوں سے بتایا جاتا ہے جیسے 'ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ' میں ہوا۔

حرکاتِ تلفظ اور نحوی اعراب کلام کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کے رد و بدل سے معنی میں فرق آ جاتا ہے۔ دونوں کے پڑھنے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مثلاً اوپر ہم نے 'اَرْجُلَكُم' کی مثال دی تھی۔ لہٰذا، متکلم کے منشا کے مطابق صحیح پڑھنے کے لیے قراءت کا سہارا لیا جانا ضروری ہے۔ اسی قراءت کی روشنی میں حجاج بن یوسف نے اعراب اور حرکات، دونوں حفاظ کے حفظ کی روشنی میں لگوائے، کوئی اضافہ نہیں کیا۔ مثلاً ''میں گھر گیا'' جملے کو جیسا بولنے والے نے بولا، اس پر اعراب لگا دیے۔ جیسے: مِیں گھُر گِیا۔ اسی طرح، انگریزی کے but اور put کے b پر اگر زبر اور p پر پیش لگا دیا جائے تو یہ کوئی متن میں تبدیلی نہیں ہو گی، جیسے butَ اور putُ۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ قراءت کے ذریعے سے تلفظِ الٰہی کو منتقل کیا۔ بعدازاں یہ تلفظِ الٰہی بہ اہتمام محفوظ کر دیا گیا۔ پھر صحابہ اور تابعین کو توفیق بخشی کہ وہ ان دونوں کو محفوظ کرنے میں جتے رہے، یہاں تک کہ متن، اعراب اور حرکات بالحفظ اور بالقلم محفوظ کر دیے گئے تاکہ اس راہ سے آنے والے احتمالات قراءتِ متواترہ سے زائل کر دیے جائیں۔

لسانِ مبین

دلالت کی قوت میں اضافے کے لیے یہ قرآن کا اگلا اہتمام ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ. (الشعراء ۲۶: ۱۹۳-۱۹۵)

''اِسے تمھارے دل پر روح الامین لے کر اترا ہے تاکہ تم بھی خبردار کرنے والے بنو۔ واضح عربی زبان میں۔''

قرآن کے اپنے بیانات کے مطابق یہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ عربی مبین کے معنی واضح زبان کے ہیں۔ ہر زبان کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ مثلاً مغلق، مشکل اور آسان۔ اسی طرح کم مستعمل زبان اور عام مستعمل زبان۔ کم مستعمل زبان کی مثالیں ہمیں ''مقامات حریری'' وغیرہ کی صورت میں ملتی ہیں، جن کو سمجھنے کے لیے بسا اوقات اہل زبان کو بھی لغات (ڈکشنری) کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ زبان کی ایک وہ سطح ہوتی ہے جسے ہم روزمرہ کی زبان کہہ سکتے ہیں۔ یہ سہل اور صبح و شام کے استعمال کی زبان ہوتی ہے۔ زبان کے اس دائرے میں الفاظ، گرامر، محاورے، جملے، تراکیب، امثال اتنی معلوم و معروف ہوتی ہیں کہ اہل زبان بغیر کسی دقت کے سمجھ لیتے ہیں۔

اس معلوم و معروف زبان کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک بازاری اور دوسرے شایستہ و مہذب۔ یہ دونوں اگرچہ مبین ہوتی ہیں، لیکن بازاری زبان کا شرفا کے ہاں چلن نہیں ہوتا، اس لیے ایک طبقہ اس سے ناواقف ہوتا ہے۔ البتہ جو شرفا کی زبان ہے، اس کا چلن ہر گھر، گلی، محلے بیٹھک اور چوپال میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی دائرے کی زبان کو اپنے ابلاغ مدعا کے لیے چنا۔ اس زبان میں اعلیٰ مضامین بیان کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن نے اس زبان کو اعلیٰ تر مضامین کے لیے سہل ممتنع[۴] اسلوب میں برتا ہے۔

چنانچہ قرآنی زبان کے مفردات، مرکبات، جملے، اسالیب، محاورے، استعارے و کنایے اس قدر معروف و

---

[۴] شعر اتنا آسان کہہ دینا کہ اس سے آسان کہنا ممتنع، یعنی ناممکن ہو۔ درج ذیل شعر اس کی مثال بن سکتا ہے:

دل کو تھاما، اس کا دامن تھام کے میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

معلوم تھے کہ سب کے لیے آسان اور سریع الفہم تھے۔ زبان کے اس دائرے میں شاذ اور غریب الفاظ کا گزر ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان کے معنی کو پانے کے لیے اہل زبان کو ذرا دقت نہیں ہوتی۔ نہ اس کلام میں کوئی انیچ پیچ ہوتی ہے[5] اور نہ قاری کو اس کے مدعا کو پانے کے لیے کوئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں[6]۔ یہی زبان اپنے تمام اجزا کے ساتھ اہل زبان کے ہاں متواترات کا حصہ ہوتی ہے، زبان کا یہ حصہ بالعموم صدیوں تک متروک نہیں ہوتا۔ اس کے مفردات و اسالیب مسلسل استعمال کی وجہ سے ــــــ زبان کی زندگی میں کبھی ــــــ شناسائی سے محروم نہیں ہوتے۔ اس کی اسی خوبی کی وجہ سے اس زبان میں کہا گیا کلام ہمیشہ زیادہ قابل فہم ہوتا ہے۔ ایسی زبان اپنے متواتر استعمالات کی معاشرے میں موجودگی کی وجہ سے احتمالات کے وجود ہی میں آنے سے روک دیتی ہے۔ اگر کہیں احتمال پیدا بھی ہو جائے تو محض تنبیہ ہی کافی ہوتا ہے۔

یک معیاری زبان

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِیۡنَ وَتُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا. (مریم۱۹:۹۷)

”سو، (اے پیغمبر)، ہم نے اِس قرآن کو تمھاری زبان میں اِسی لیے سہل اور موزوں بنا دیا ہے کہ تم اُن لوگوں کو اِس کے ذریعے سے بشارت دو جو خدا سے ڈرنے والے ہیں اور اِن ہٹ دھرم لوگوں کو اِس کے ذریعے سے خبردار کر دو۔“

لسان مبین میں لکھے گئے کلام میں بھی احتمالات پیدا ہو سکتے ہیں، اگر وہ متعدد علاقائی لہجوں کا مجموعہ ہو، اور معلوم نہ ہو سکے کہ متکلم نے کس جملے میں کس علاقے کے محاورے اور لہجے میں بات کی ہے۔ مثلاً ہماری اردو میں دہلوی، لکھنوی اور پنجابی لہجے ہیں۔ انگریزی میں برطانوی اور امریکی لہجے ہیں۔ اگر کوئی مصنف بغیر کسی امتیاز کے امریکی اور برطانوی لہجوں کو برابر استعمال کرتا جائے تو سوال پیدا ہو جائے گا کہ اس جملے میں لفظ برطانوی معنی میں آیا ہے یا امریکی معنی میں؟ مثلاً امریکیوں کا لفظ hood لباس بھی ہے اور گاڑی کا بونٹ بھی۔ جب کہ برطانیہ میں ایسا نہیں ہے، وہاں لباس تو ہے، مگر بونٹ اس کے معنی میں نہیں آتا۔ چنانچہ اگر کوئی مصنف امریکی اور برطانوی لہجوں کو بلا امتیاز

---

[5] الزمر۳۹:۲۸۔ ’قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ‘۔

[6] الزمر۳۹:۲۸۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

استعمال کرتا جائے تو کئی مقامات پر احتمالات کو زائل کرنا، ناممکن ہو جائے گا۔ ہم نہیں جان سکیں گے کہ یہاں لفظ برطانوی معنی میں آیا ہے یا امریکی میں۔ کہتے ہیں کہ چرچل کے لیے اپنے برطانوی اتحادیوں کے ساتھ میٹنگ میں ایک فعل 'to table' غلط فہمی کا باعث بن گیا تھا۔ امریکی لہجے میں اس کا مطلب تھا، ایجنڈے سے کسی آئٹم کو ملتوی کر دیا جائے، جب کہ برطانوی انگریزی میں اس کا مطلب تھا کہ اب اس نقطے کو میز پر، یعنی گفتگو میں لایا جائے۔

عربی زبان بولنے والوں کے بھی کئی علاقے اور لہجے تھے۔ ہر علاقے کے الفاظ اور عربی اسالیب و محاورات کا فرق آ جاتا تھا۔ جس سے کلام میں احتمالات کا امکان نہ صرف بڑھ جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات ان کا زائل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ قرآن صرف ایک لہجے میں اترا ہے۔ دیگر عربی لہجوں کا اس میں دخل نہیں ہے: یعنی 'یَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ'۔ قرآن میں 'سٰمِدُوۡنَ' کا لفظ آیا ہے[۷]۔ کہا جاتا ہے کہ حمیری زبان میں اس کے معنی گانے والوں کے تھے (تفسیر مجاہد سورۂ نجم آیت ۶۱)۔ اب اس مقام کو نکال لیے تو اگر ہم دونوں عربی لہجوں کا اعتبار کریں تو ہمارے پاس پیدا ہونے والے احتمالات میں سے ایک طے کرنے کے لیے شاید کوئی واضح قرینہ نہ ملے۔ قرآن کا فرمان ہے:

اَفَمِنۡ هٰذَا الۡحَدِيۡثِ تَعۡجَبُوۡنَ. وَتَضۡحَكُوۡنَ وَلَا تَبۡكُوۡنَ. وَاَنۡتُمۡ سٰمِدُوۡنَ. فَاسۡجُدُوۡا لِلّٰهِ وَاعۡبُدُوۡا. (النجم ۵۳: ۵۹-۶۲)

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

اگرچہ 'سٰمِدُوۡنَ' کو یہاں گانے والوں کے معنی میں لینا مضمون سے مطابقت نہیں رکھتا، اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس ذوق کے سوا کوئی ظاہری قرینہ نہیں ہے۔ اب فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ قرآن قریش کی زبان ـــــ جو نبی اکرم کی زبان ہے ـــــ میں اترا ہے۔ تو اس زبان میں 'سٰمِدُوۡنَ' کے جو معنی ہیں یہاں وہی مراد ہوں گے۔ قرآن کی واضح نص ہے کہ قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عربی میں اترا ہے نہ کہ حمیری وغیرہ میں۔ قرآن کے الفاظ میں یہ بات یوں کہی گئی ہے: 'فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ' ''ہم نے تو بس 'اس (لیے قرآن) کو تمھاری زبان میں میسر کیا ہے کہ یہ (خوب) یاد دہانی حاصل کر سکیں'' (الدخان ۴۴: ۵۸)۔ قرآن اسی ایک زبان میں اترا ہے، اس لیے دوسرے لہجوں سے پیدا ہونے والے احتمالات صرف اسی بات سے مرجوح قرار پا جائیں گے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہیں ہے۔ یوں قرآن کا ایک لسانی لہجہ مقرر کرنا، بہت احتمالات کو رد کر دیتا ہے، جو مفسرین نے اختیار کر رکھے ہیں۔

۷۔ النجم ۵۳: ۶۱۔

اس لیے قریشی نحو وصرف، لغات اور بلاغت وفصاحت قرآن کے مفاہیم میں رد احتمالات کا ذریعہ ہوگی۔ خلافتِ راشدہ میں صحابہ کا طرزِ عمل اس کی واضح تائید کرتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے 'التابوت' کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ 'التابوہ' ہے یا 'التابوت' تو انھوں نے کہا کہ 'التابوت' صحیح ہے۔ اس لیے کہ قریشی لہجے کے مطابق یہ 'التابوت'، اس لیے مانا جائے گا کہ قرآن قریش کی زبان میں اترا ہے (المقنع فی رسم مصاحف الأمصار ص ۱۵)۔

سیاق وسباق کی تشکیل

یہ رد احتمالات کا ایک اور ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو قیامت تک کے لیے معنی آفرین بنائے رکھنے کے لیے سیاق کلام نہایت عمدگی سے ترتیب دیا ہے۔ اس میں لفظی سیاق، مضمون کا سیاق، مخاطب اور متکلم اور شان نزول کے سیاق کو بھی کلام کے اندر پرو دیا گیا (woven) ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں ہے، اسے ہمارے مدرسے کے جلیل القدر مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ثابت کر دیا ہے[۸]۔ ذیل کی آیت میں جمع قرآن کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ حکیم وحمید کا فرمان ہے:

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ. (القیامہ ۷۵: ۱۷-۱۹)

''اس کا جمع کرنا اور قراءت کرنا، سب ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے جب ہم اس کی قراءت کریں تو اس کی اس قراءت کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی ذمے ہے کہ ہم اس کی وضاحت کر دیں۔''

سیاق وسباق دو طرح کا ہوتا ہے: ایک عبارت کا اور دوسرا تاریخی۔ عبارت کے سیاق وسباق کا مطلب تو یہ ہے کہ کلام کے اندر جو مضمون یا الفاظ ہیں، وہ ایک سیاق وسباق بنا رہے ہوتے ہیں، قدما اسے قرائن مقالیہ کا نام دیتے تھے۔ تاریخی سیاق وسباق سے ہماری مراد نزول قرآن کے وقت کی صورت حال ہے۔ ''شان نزول'' اور ''قرائن حالیہ'' کے الفاظ میں بھی انھی کو مراد لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کمال قدرت کے ساتھ دونوں کو کلام میں اس طرح بُن دیتا ہے کہ موقع محل، مخاطب وغیرہ سب واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے ہمارے پچھلے مضمون میں سورۂ احزاب کی مثال کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۸۔ دیکھیے ''تدبر قرآن'' اور ''البیان''۔

قرآن مجید جستہ جستہ اترا ہے۔ لیکن بعد میں اسے جبریل امین کی راہنمائی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ترتیب دے کر امت کو دیا ہے۔ اسے ترتیب توقیفی کہا جاتا ہے۔ قرآن جس طرح اترا تھا، اگر ویسے ہی جمع کر دیا جاتا ـــــ آیات سورتوں میں نہ ڈھلتیں، اور نہ سورتوں کی کوئی ترتیب قائم کی جاتی ـــــ تو بلاشبہ سیاق وسباق تشکیل نہ پاتا۔ پھر یہ اسی طرح کی کتاب ہوتی جس طرح آج کل اقوال زریں (Quotations) کی کتابیں ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کا معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اپنی اس ترتیب کی وجہ سے آیات کا سیاق وسباق بنتا ہے، جسے صحابہ اور عموماً مفسرین نے فہم قرآن میں ملحوظ رکھا ہے۔ یہ سیاق وسباق احتمالات کو رد کرنے میں بہت قوی کردار ادا کرتا ہے۔

اسے پہلے ایک آسان مثال سے سمجھتے ہیں۔ ذیل کی آیت سے کوئی لاخیر اَیہ مطلب نکال سکتا ہے کہ قرآن کے اختتام کے وقت اللہ تعالیٰ نے 'فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ' (الماعون ۱۰۷:۴) کے الفاظ میں نماز پڑھنے سے روک دیا ہے کہ نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے۔ ایسی بات تبھی ممکن ہے کہ اس آیت کو اس کے سیاق وسباق سے کاٹ لیا جائے۔ سیاق وسباق سے واضح ہے کہ ریاکار اور غفلت شعار نمازیوں کو وعید ہے۔ ہر آیت اپنے مقام پر نگینے میں جڑے موتیوں کی طرح ہے۔ اگر اسے وہاں سے نکال لیں تو معنی تو وہ پھر بھی دے گی، لیکن کبھی اپنے اصل معنی سے محروم ہو جائے گی جیسا ہم نے 'فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ' کے بارے میں ابھی دیکھا، اور کبھی حسن معنی سے۔

ذیل میں ایک اور مثال سے بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سورۂ کوثر دیکھیے:

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ. اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الۡاَبۡتَرُ. (۱۰۸:۱-۳)

''ہم نے تمھیں خیر کثیر عطا کیا، اس لیے اپنے رب کی نماز پڑھو اور اس کے لیے قربانی کرو، بلاشبہ تیرا دشمن ہلاک ہوگا۔''

سب سے پہلے سورہ کی داخلی باتوں کو سمجھنے کے لیے اسے اپنے مقام سے اگر الگ کر لیتے ہیں۔ یہ عرف قرآن سے واضح ہے کہ 'اَعۡطَیۡنٰکَ' کے 'کافِ' خطاب سے مراد نبی آخر الزمان ہیں۔ آپ کو یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے آپ کو 'الکوثر' عطا کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ نماز پڑھیں اور قربانی دیں۔ آگے بڑھیے، تو اچانک آپ کے دشمنوں کے ابتر ہونے کی وعید اور خبر سنائی گئی ہے۔

اب ان تین چیزوں پر غور کریں کہ یہ تینوں چیزیں 'الکوثر' سے کیا تعلق رکھتی ہیں۔ اس تعلق پر غور کرنا اس لیے ضروری ہے کہ 'اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ' کے فوراً بعد 'فاء' سے عطف کر کے یہ باتیں کہی گئی ہیں۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ 'فاء' سے عطف پچھلی بات سے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہوتا ہے۔ بات کو سمجھنے کے لیے اردو کی ایک

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مثال پر غور کریں۔ کوئی اپنے بیٹے کو ایک چیز بھیجے اور اسے خط میں لکھے:

''میں تمھیں ایک بہت مفید چیز بھیج رہا ہو، تو تم وقت پر اٹھنا اور وقت پر اسکول جانا، سکول کا چوکیدار تمھیں نہیں روکے گا۔''

اب دیکھیے، 'تو' کے بعد کے جملے بتا رہے ہیں کہ اس 'مفید چیز' کا تعلق 'وقت' سے ہے۔ ان جملوں سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ 'مفید چیز' وقت معلوم کرنے کی سہولت فراہم کرے گی، یعنی گھڑی بھیجی گئی ہے۔ جس کی مدد سے وقت پر اٹھنا اور اسکول جانا ممکن ہوگا تو چوکیدار کے روکنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ تو خط کے ان تین جملوں سے ہمیں ساری کہانی سمجھ میں آ گئی۔

ٹھیک ایسے ہی جملے سورۂ کوثر کے ہیں۔ ان میں بھی جو چیز عطا کی گئی بر بنائے مصلحت اس کا نام نہیں لیا گیا۔ اس کا ذکر بس 'الکوثر' کے وصف سے کیا ہے۔ 'کوثر' دراصل وہ چیز یا شخص ہے جس سے بے پناہ فیض ملتا ہو، اسی لیے بہت سخی شخص کو 'کوثر' کہتے ہیں۔ اوپر گھڑی والے جملے کی طرح 'کوثر' عطا کرنے کے بعد دو حکم دیے گئے ہیں کہ نماز پڑھنا اور قربانی دینا۔ اب انسانی ذہن فوراً اس طرف جائے گا کہ وہ کون سی فیض رساں چیز ہے جس کے ملنے کے بعد نماز اور قربانی ہوگی۔ قرآن کے مخاطب قریش، یعنی آل ابراہیم جانتے ہیں کہ بیت اللہ ہی وہ جگہ ہے جس میں یہ دونوں کام کیے جاتے ہیں۔ تیسری آیت یہ بتاتی ہے کہ اس قربانی اور نماز سے متعلق 'الکوثر' کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے بھی کوئی معاملہ ہے۔ یہ سورہ مکی ہے، اور ہمیں معلوم ہے کہ مکہ اور مدینہ کے بھی کئی سال تک بیت اللہ کفار مکہ کے قبضے میں رہا۔ اب اللہ تعالیٰ اس دور میں کہہ رہے ہیں کہ ہم نے تمھیں بیت اللہ عطا کیا، جب آپ کو مل جائے تو نماز ادا کیجیے گا اور قربانی نذر کیجیے گا، رہا یہ دشمن، جس کے قبضے میں بیت اللہ ہے، اب وہ اس پر کنٹرول نہیں رکھ سکے گا، اس لیے کہ اس کی جڑ کٹ جائے گی۔

یوں سورہ کے الفاظ و جمل نے ہمیں بتا دیا کہ یہ سورہ کس صورت حال میں اتری، یعنی اس سورہ کی شانِ نزول کیا ہے، اس وقت دشمن کی کیا حالت تھی، کعبہ کن کے قبضے میں تھا، اور کعبے کے ساتھ جو دو عبادات[9] جڑی تھیں، ان کے کرنے سے مسلمان رکے ہوئے تھے۔ اس موقع محل سے ہم پر یہ بات مزید کھلی کہ 'اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ' کے الفاظ بشارت اور وعدے کے تھے، فوری دے دینے کے معنی میں نہیں تھے۔ تو اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید چند جملوں پر

---

[9] یہ دونوں عبادات حج و عمرہ کے لیے کنایہ بھی ہیں۔ جیسے تسبیح و حمد کے الفاظ نمازِ پنج گانہ کے لیے، متعدد مقامات پر، قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔

مشتمل سورت میں بھی کس شان کے ساتھ موقع محل کو مصور کر کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اب یہ سورت جن سورتوں کے درمیان رکھی گئی ہے، انھوں نے بھی ایک موقع محل تشکیل کیا ہے۔ یہاں مضمون میں اس کی توضیح طوالت کا باعث ہوگی۔ استاذ گرامی کی ''البیان'' میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ مختصراً صرف اس کے بعد کی تین سورتوں کے مضامین کے اشاروں سے موقع محل بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ موقع محل کی ایک ہلکی سی تصویر سامنے آ جائے۔

سورۂ کوثر کے بعد کی صرف تین سورتیں دیکھیں تو وہ سورۂ کافرون، سورۂ نصر اور سورۂ لہب ہیں، سورۂ کافرون دشمن پر اتمام حجت کے بعد ان کی تکفیر کو بیان کرتی ہے۔ سورۂ نصر خدا کی مدد اور فتح مکہ، یعنی حصولِ کعبہ کا پتا دیتی ہے۔ جب کہ سورۂ لہب، ابولہب اور کفار کے دیگر لیڈروں کی ہلاکت کی خبر دیتی ہے۔ چنانچہ اس سیاق وسباق سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ جو تعلق سورۂ نصر اور سورۂ لہب کا ہے وہی تعلق 'اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ' اور 'اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الۡاَبۡتَرُ' کا ہے۔ یعنی فتح مکہ اہل مکہ کے سرداروں کی ہلاکت پر منتج ہوگی۔

اس طرح قرآنی اسلوب میں تاریخی سیاق وسباق، شانِ نزول یا قرائن حالیہ متن میں ملفوف ہو کر آ جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قرآن مجید قرائن حالیہ کو بھی قرائن مقالیہ کا حصہ بنا دیتا ہے[10]۔ یہ سیاق وسباق کی دوہری تہری تہیں بناتا ہے:

۱۔ جملے کا سیاق،

۲۔ پورے پیراگراف کا سیاق،

۳۔ سورتوں کا باہمی سیاق،

اس سہ گونا سیاق وسباق کو ترتیب توقیفی میں قائم کر کے وہ کام کیا گیا ہے، جو ہماری گفتگوؤں میں ہمارا ماحول سرانجام دیتا ہے۔ قرآن نے اس ترتیب سے یہی کام لیا ہے کہ وہ اس وقت کی صورت حال کو کلام میں پرو دیتا ہے تاکہ قاری معنی سے چوکنے نہ پائے۔

تصریف آیات

ادواتِ ابلاغ میں اگلی چیز یہ ہے کہ ایک بات کو مختلف الفاظ اور مختلف سیاق وسباق میں بار بار دہرا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[10] واضح رہے کہ سیاق وسباق یا قرائن مقالیہ ہی کی وجہ سے کلام کے عام وخاص ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنٰهُ بَيۡنَهُمۡ لِيَذَّكَّرُوۡا فَاَبٰٓى اَكۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوۡرًا. (الفرقان ۲۵: ۵۰)

''ہم نے اس (قرآن) کو ان کے درمیان طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ یہ یاددہانی حاصل کریں، مگر اکثر لوگ ناشکری کیے بغیر نہیں رہتے۔''

تصریف کے بہت سے فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ بات کو بار بار دہرانا، مضمون کو واضح اور ازبر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مختلف اسالیب اور سیاق وسباق میں دہرانے سے بات کئی پہلوؤں سے واضح ہو جاتی ہے، اسی بات کو اوپر آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ ہم اپنی افتادِ طبع، ذوقِ فکر، تہذیبی اقدار اور معلومات کے اسیر ہوتے ہیں۔ قرآن کے اولین مخاطب اگرچہ ایک ہی تہذیب کے افراد تھے۔ لیکن افتادِ طبع اور ذوقِ فکر اور معلومات کا فرق فہم اور حصول علم میں فرق پیدا کر دیتا تھا۔ لہٰذا ہر ذوق طبع کے لیے مختلف انداز میں بات سمجھانا پڑتی ہے۔ اگر ذوقِ طبیعت کی وجہ سے کسی آیت کے فہم میں ناکامی ہو تو دوسرا مقام ہماری مدد کرتا ہے۔

یہ تصرف کئی پہلوؤں سے ردّ احتمالات میں مددگار ہے۔ مثلاً قرآن مجید نے بسا اوقات، الفاظ تک کو یوں استعمال کر دیا ہے کہ ایک مقام دوسرے مقام کے لیے لغات بن جاتا ہے۔ قرآن نے اپنے ان مضامین کو اس قدر دہرایا ہے کہ وہ قاری کے لیے جانے پہچانے مضامین بن جاتے ہیں، جس سے وہ دوسرے مقامات میں غلطی کھا جانے سے بچ جاتا ہے۔ قرآن کبھی ایک مضمون کو مختلف الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اور کبھی الفاظ وہی رکھتا ہے، مگر سیاق وسباق بدل دیتا ہے، وغیرہ۔ ان تصریفات سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب ایک طرح کے الفاظ میں بات سمجھ نہ آئے تو الفاظ بدل کر rephrase کر دیا جاتا ہے اور جب ایک سیاق وسباق سے بات سمجھ نہ آئے تو دوسرے سیاق وسباق میں بات سمجھ آ جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر نئے سیاق وسباق میں اسی بات کا ایک نیا پہلو واضح ہوتا ہے۔ یوں تصریفات مضامین کا گھیراؤ کرتے ہیں، اور ہمیں بھٹکنے سے بچا لیتے ہیں۔

یہ اسلوب ایک کائناتی حقیقت کی طرح ہے۔ خدا کی تخلیق کا ڈیزائن ایسا ہے کہ ایک چیز ایک ہی جگہ اور ایک ہی صورت میں نہیں پائی جاتی۔ مثلاً نمک کو لیجیے، وہ صرف نمک کی کانوں ہی میں نہیں پایا جاتا، بلکہ وہ سبزیوں، گوشت، پھلوں کئی صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں نے گوشت کھانا چھوڑا تو انھیں پروٹین دالوں اور سبزیوں سے ملتی رہی ہے۔ ٹھیک یہی ڈیزائن قرآن کا ہے۔ ایک حکمت ایک ہی جگہ نہیں، بلکہ مختلف پیرائے میں، مختلف لطافتوں کے ساتھ مختلف مقامات پر ملے گی۔ جس نے نہ صرف مختلف الذہن لوگوں کی فطرتِ فہم کو سیراب کرنے کا سامان کیا ہے، بلکہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس سے آیات ایک دوسری کی تفسیر میں بھی مددگار بن گئی ہیں۔ جو ہمارے لیے قرآن کا معروف تشکیل کرتیں اور ذریعہ حجت واستشہاد بنتی ہیں۔

قرآن میں تصریف میں کبھی بعینہٖ وہی الفاظ دہرائے جاتے ہیں، کبھی صرف سیاق وسباق بدلا جاتا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثالیں صفات الٰہی ہیں۔ مثلاً صفتِ رحمت ہی کو پورے قرآن میں نکال کر دیکھ لیجیے ہر مقام پر رحمت کے نئے پہلو سامنے آتے جائیں گے۔ لفظی تصریف کی ایک آسان فہم مثال سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں 'لَا رَیْبَ فِیْہِ' کی ہے۔ یہاں مفسرین کو تردد پیش آیا کہ یہ کس معنی میں ہے۔ یعنی کتاب کا مضمون 'لَا رَیْبَ فِیْہِ' والا ہے یا اس کا کتاب الٰہی ہونا؟

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. (البقرہ ۲:۲)

''یہ وہی کتاب ہے، اس میں کچھ شک نہیں۔ متقین کے لیے ہدایت ہے۔''

لیکن یہ تردد دوسرے مقام پر دور کر دیا گیا ہے۔ وہاں اسی طرح کے سیاق وسباق میں 'لَا رَیْبَ فِیْہِ' کو دہرایا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ سجدہ میں اس بات کو لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے 'لَا رَیْبَ فِیْہِ' سے کیا مراد ہے:

الٓمّٓ. تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ. (السجدہ ۳۲:۱-۳)

''یہ 'الم' ہے، اس کتاب کے رب العالمین کی طرف سے بہ اہتمام نزول میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ آیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے گھڑ لیا ہے! نہیں ایسا نہیں ہے یہ تو تمھارے رب کی طرف سے اترا حق ہے تاکہ تم ایک ایسی قوم کو آگاہ کرو، جن کے پاس تم سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تاکہ یہ ہدایت پائیں۔''

یہ مثال ایسی ہے کہ اس میں 'لَا رَیْبَ فِیْہِ' جیسے معمولی سے مرکب کو سمجھایا گیا ہے۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تصریف سے اور کیا کیا واضح ہو سکتا ہے۔ مضمون کی تصریف کی مثال بھی انھی آیتوں میں موجود ہے۔ 'لَا رَیْبَ فِیْہِ' سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن یہ شبہ کس نوعیت کا ہے، وہ البقرہ کی آیت سے معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ سورۂ سجدہ کی مذکورہ بالا آیت ۳ سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ لوگ اسے افترا کہہ رہے تھے۔ اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آیا یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی پیش نظر ہے؟ تو اگرچہ یہاں البقرہ کے آغاز میں اس مضمون کے کوئی شواہد نہیں ہیں، لیکن ۲۳ ویں آیت سے واضح ہے کہ وہاں بھی یہ پہلو پیش نظر تھا: 'اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ'

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(البقرہ۲:۲۳)۔'فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ 'ظاہر ہے افترا کے جواب میں[۱۱] ہی آیا ہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ انسانی کلام ہے، اور یہ صاحب خود لکھ کر پیش فرما رہے ہیں، تو اپنے اس الزام میں اگر سچے ہو تو اس جیسا کلام لے آؤ۔ سو واضح ہوا کہ وہ مضمون جو السجدہ کی پہلی آیت میں کھول دیا گیا ہے، وہ البقرہ کی دوسری آیت میں مضمر تھا، جسے ۲۳ ویں آیت میں کھولا گیا ہے۔ اس تصریف سے معلوم ہوا کہ البقرہ کی دوسری آیت کے جملے: 'ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ' کا ایک پہلو آیت ۲۳ میں زیر بحث آیا ہے۔ ان آیتوں میں تصریف کے اور شواہد بھی ہیں۔ لیکن ان کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

عدم تضاد

یہ ادواتِ ابلاغ کا اگلا عنصر ہے۔ اسے بھی قرآن نے بیان کر دیا ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (النساء۴:۸۲)

''اور کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں وہ بڑا اختلاف پاتے۔''

یہ آیت ایک طرف اس کتاب کے الٰہی ہونے کا استدلال ہے تو دوسری طرف یہ قرآن کا ایک ابلاغی وصف بھی ہے۔ اس اصول کی وجہ سے سارے کا سارا قرآن اپنی ہر ہر آیت کے لیے شاہد و نگران ہے۔ اب اگر کوئی آدمی کسی آیت کی ایسی تفسیر کرے جو کسی دوسری آیت سے ٹکراتی ہو، تو وہ تفسیر قبول نہیں کی جائے گی۔ یوں پورا قرآن دلالت کے لیے غایت درجہ معاون ہے۔ ہم انسانوں کے کلام میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ حد یہ ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں لکھی گئی ہماری کتابوں میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔

تبیین الٰہی

مدعائے قرآنی کو دوٹوک کرنے کے لیے یہ اگلا بندوبست ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ تھا کہ نزولِ قرآن کے دوران میں قرآن سے متعلق جو بھی سوالات پیدا ہوں گے، اس کی بہ قدر حکمت و ضرورت تبیین کر

---

[۱۱] اس بات کی تصریف اس آیت میں ہوئی ہے: 'اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ' (یونس۱۰:۳۸)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دی جائے گی۔ سورۂ قیامہ آیت جمعِ قرآن ہم نے اوپر قراءت کی بحث میں پیش کی ہے، اس میں یہ وعدہ تھا کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ‘(۷۵:۱۹)، یعنی جمع کرنے اور قراءت کرانے کے بعد اگلی ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس کی توضیح بھی کر دیں گے۔ چنانچہ قرآن میں بہت سے سوالات خواہ وہ پوچھے گئے ہوں یا ذہنوں میں ابھرے ہوں، ان کا جواب دیا گیا ہے۔ ان جوابات کو قرآن میں جگہ جگہ کچھ الفاظ سے نمایاں کر دیا ہے تاکہ ان توضیحی آیات کی نشان دہی ہو جائے۔ مثلاً ان آیات میں ’وَيَسْـَٔلُوْنَكَ ‘(البقرہ۲:۲۲۲)، ’وَيَسْتَفْتُوْنَكَ ‘(النساء۴:۱۲۷) یا ’كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ‘(البقرہ۲:۲۴۲) وغیرہ جیسے الفاظ سے نشان دہی کی گئی ہے کہ یہ آیاتِ تبیین ہیں۔ اس طرح کی آیات میں یا تو کسی فروعی مسئلے کا جواب دیا گیا ہے، جس سے مجمل آیات کی توضیح کی گئی ہے۔ اس عمل سے بھی تردد و احتمال کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ان توضیحی آیات کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اصلاً فہم آیات میں احتمالات کے رد کے لیے نہیں اتریں۔ بلکہ واضح اور دوٹوک بات سے کچھ فروعی مسائل پیدا ہوئے، بس ان کا جواب دیا گیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگانا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ یہ توضیحات دراصل فہم متن سے زیادہ فقہی معاملات سے متعلق تھے۔ ابلاغِ مدعا کا سرے سے کوئی معاملہ قرآن کے سوالات میں زیر بحث ہی نہیں آیا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اولین سامعین کو فہم مدعا میں کوئی اشکال پیش نہیں آیا تھا۔ یعنی ان کے لیے قرآن دوٹوک اور بالکل واضح تھا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محکم اور مفصل آیات

یہ دوہرا اسلوب قرآن کو دلالت میں واضح تر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنایا ہے۔ قرآن مجید میں دو طرح سے بات کی گئی ہے: محکم اور مفصل۔ یعنی کچھ آیات ایجاز کے اسلوب میں ہیں اور کچھ تفصیل و توضیح کے اسلوب میں۔ اس بات کو سورۂ ہود کی پہلی آیت یوں بیان کرتی ہے:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ. (۱۱:۱)

’’یہ کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے اُن کی تفصیل کی گئی ہے۔‘‘

یہ کلام کو دلالت میں محکم کرنے کا نہایت عمدہ حل ہے۔ اجمال کی خوبی یہ ہے کہ ایک جملے میں جہانِ معنی پرو دیتے ہیں۔ ایسا کلام یک جنبش لب پوری بات سامنے رکھ دیتا ہے۔ ایسے جملوں کو حدیث میں جوامع الکلم کہا گیا ہے۔ یہ کوزے میں دریا کی بندش ہے۔ زیرک اور حکیم آدمی کے لیے یہ کلام خزینے سے کم نہیں ہوتا۔ قرآن نے اس اسلوب

کو بہت برتا ہے۔

تفصیلی کلام بات کو بسیط بنانے کا نام ہے۔اس میں اجمال کے پردے ہٹا کر بات لفظوں میں بیان کر دی جاتی ہے۔اس تفصیل سے وہ لوگ بھی بات کو سمجھ جاتے ہیں، جو جوامع الکلم میں مدعا پانے میں کمزور ہوتے ہیں۔اسی طرح قومی اور علاقائی مزاج اور تربیت بھی اس میں کردار ادا کرتی ہے۔ یہ فرق ہمیں مشرکین مکہ اور یہودِ مدینہ میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔مکی کلام زیادہ تر پہلی صنف کے تحت آتا ہے، جب کہ مدنی کلام تفصیلی کلام کی صنف کے تحت۔

قرآن مجید یوں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ دونوں اسالیب کو اختیار کرتا ہے۔اس کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ سورۂ عصر میں پہلا جملہ یہ کہتا ہے کہ ''زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے،سوائے ان کے جو ایمان لائے''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے سے کیا مراد ہے: آخرت یا دنیا؟ اگر آخرت مراد ہے تو دلیل کیسے بنے گی، دوسرے یہ کہ یہ کہنا کہ ــــ زمانہ گواہ ہے کہ لوگ آخرت میں کامیاب ہوں گے ــــ موزوں نہیں ہے؟ اگر دنیا مراد ہے تو زمانہ کی گواہی تو اس کے برعکس معلوم ہو رہی ہے کہ اہل ایمان بھی کامیاب ہوتے ہیں اور کفار بھی۔تو پھر آیت کا مطلب کیا ہوا؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر کی گئی ہے۔جس سے بات واضح ہو جاتی ہے۔مثلاً سورۂ ہود کی ذیل کی آیت دیکھیے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَمِنۡ خِزۡیِ یَوۡمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ. وَاَخَذَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا الصَّیۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دِیَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ. (۱۱: ۶۶-۶۷)

''جب ہمارا (عذاب کا) فیصلہ آ گیا تو ہم نے صالح کو اور جو لوگ ایمان لائے تھے، انھیں بھی ان کے ساتھ اپنی رحمت کی بنا پر بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے بھی بچا لیا، بے شک تیرا پروردگار قوی وعزیز ہے۔''

پورے قرآن مجید میں اس طرح کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔تمام مقامات کو پڑھ کر واضح ہوتا ہے کہ رسول کے زمانے میں کافروں پر جو عذاب آتا ہے، اس میں مومنین کو بچا لیا جاتا ہے اور کفار کو عذاب سے مٹا دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ان الفاظ پر توجہ دیں: 'نَجَّیۡنَا صٰلِحًا وَّالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا' ہم نے صالح اور اہل ایمان کو بچا لیا۔یوں 'و العصر' میں کون سا زمانہ مراد ہے اور صرف اہل ایمان کب بچائے جاتے اور صرف کفار کب ہلاک کیے جاتے ہیں، واضح ہو جاتا ہے۔اوپر سیاق وسباق کی سرخی کے تحت بھی ایک مثال اس کی گزری ہے، سورۂ کوثر محکم سورہ ہے اور سورۂ نصر اور سورۂ لہب اسی مضمون کی تفصیل کرتی ہیں۔اجمال وتفصیل کا یہ تعلق بھی تعیینِ مدعا اور فہم کلام کے لیے ابلاغی ادوات میں سے نہایت موثر ہے۔

یہ نو کے قریب امور ہیں، جو قرآن مجید کو ابلاغ مدعا کے معاملے میں عام کلاموں سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ہر بولنے والا، الفاظ کی دلالت، کلام کی بنت، زبان کے تواتر، سیاق وسباق کی بندش سے کلام کو ابلاغ مدعا میں بلیغ بنتا ہے۔ لیکن قرآن صرف یہی چیزیں استعمال نہیں کرتا، بلکہ وہ ان پر ان مذکورہ بالا چیزوں کا مزید اضافہ کرتے ہوئے اسے 'بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ'[12] (البقرہ ۲: ۱۸۵) بنادیتا ہے۔ وہ اپنے مدعا کو اس قدر واضح کر دیتا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے کہ اب رسول کے بعد اس حق کے انکار کی کوئی دلیل و حجت باقی نہیں رہی (النساء ۴: ۱۶۵)۔ اسی بنا پر قرآن یہ کہنے میں حق بہ جانب ہے کہ اس کی آیات سے غلط معنی مراد نہیں لیے جا سکتے، بلکہ قرآن میں عمومی کلام والے قرائن اور اس الٰہی اہتمام کے ساتھ جس کا ہم نے ذکر کیا، کلام کو چاروں طرف سے ابلاغ کے ادوات سے لیس کر دیا گیا ہے کہ اب اگر اس کے کلام کو پارہ پارہ کر کے نہ پڑھا جائے، اور 'یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ'[13] نہ کیا جائے تو ناحق تاویل اس کی آیاتِ بینات قبول نہیں کریں گی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ (فصلت ۴۱: ۴۲)

"اس میں باطل کا ورود نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ دانا اور خوبیوں والے کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔"

www.javedahmadghamidi.com

یعنی یوں تو ہر کلام میں یہ خوبی ہے کہ وہ غلط تاویل کو روکتا ہے، لیکن خدائے حکیم وحمید کی ان صفات کا مظہر اس کتاب کا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ وہ اس معاملے میں اتنی دوٹوک ہے کہ وہ باطل کو اگل دیتی ہے۔ بقولِ شاعر

این کتابے نیست چیزے دیگر است[14]

---

[12] ہدایت کی دوٹوک آیات اور معیارِ حق و باطل۔

[13] کلام کو اس کے موقع محل سے ہٹا دینا۔

[14] یہ کوئی کتاب نہیں، کوئی اور ہی چیز ہے۔